عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!!

اِدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ

ربیع الاوّل ۱۴۲۵ھ / اپریل ۲۰۰۵ء

Reg No: P 476

جلد سوم: شمارہ:۸

فہرست

عنوان	صاحب مضمون	صفحہ نمبر
مجمع اور تنہائی کے پہلو	حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ	۳
اہل سنت والجماعت	علامہ سید سلیمان ندویؒ	۸
فقیرِ مدینہ	ڈاکٹر اعجاز خٹک	۱۴
سفرنامہ مقدونیہ	ڈاکٹر قیصر علی	۱۶
اصلاحی مجلس	حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہ	۲۱
سنت، مستحب، ادب، مندوب تعریفات واحکام	ڈاکٹر عبید اللہ، خلیفہ ڈاکٹر فدا محمد مدظلہ	۲۶
رحمۃ اللعالمینؐ	حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہ	۳۱

فی شمارہ: ۱۵ روپے

سالانہ بدل اشتراک: ۱۸۰ روپے

خط وکتابت کا پتہ: مدیر ماہنامہ غزالی

مکان نمبر: P-12 یونیورسٹی کیمپس

پشاور

ای۔میل: saqipak99@gmail.com

saqi_pak99@yahoo.com

مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ

مجمع اور تنہائی کے پہلو

مجمع میں بھی اور تنہائی میں بھی دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اچھائی کا اور ایک برائی کا۔

ظاہرش چوں گورِ کافر پر خلل　　باطنش قہرِ خدائے عزوجل

ظاہر میں انسان اپنے آپ کو بہت نیک اور پارسا بناتا ہو لیکن باطن شر و فساد سے بھرا ہوا ہو تو یہ منافقین کی علامت ہے۔ منافقین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مسجد نبوی میں نماز پڑھتے تھے لیکن ان کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء:۱۴۵)

ترجمہ: بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے۔

عبداللہ بن ابی مدینہ میں رئیس المنافقین تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی سازشیں کیا کرتا تھا۔ اس کا جب انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا کرتہ مبارک پہنایا اور جنازہ کی نماز پڑھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ط﴾ (التوبہ:۸۴)

ترجمہ: اور اُن میں کوئی مر جاوے تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ (دفن کے لیے) اس کی قبر پر کھڑے ہو جیئے

ہمارے جسموں کی قبروں کے اندر بھی رُوحوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ جن رُوحوں میں اللہ تعالیٰ کا تعلق اور یاد نہ ہو تو وہ بمثل مردہ کے ہیں۔ اگر رُوحوں میں اللہ تعالیٰ کا تعلق، محبت اور خشیت ہو تو یہ ارواح زندہ اور پُرانوار ہیں، اور ایسی ارواح ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایمان نہیں اور اندر سے یہ ارواح گندی ہیں تو یہ بھی عبداللہ بن ابی کی لاش کی مانند ہیں، جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز پڑھی تھی لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو نہیں بخشا جائے گا۔ نماز سب سے اونچا عمل ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ:۱۴)

ترجمہ: کہ نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو۔

ہماری نماز کا ظاہر لوگوں پر یہ ظاہر کررہا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہیں لیکن اگر دل کے کونوں کو بھی اچھی طرح سے تلاش کیا جائے کہ اس میں خدا بھی ہے یا نہیں تو جواب نفی میں ہوگا۔ ہر مصیبت اور بلا...دل کے اندر بھری ہوئی ہے، اگر نہیں ہے تو ایک اللہ تعالیٰ کی یاد نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ والوں کا حال یہ ہے کہ نماز کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ فرماتے ہیں ؎

حریم دل سے باہر آ کے تو ڈھونڈو ذرا مجھ کو   تمہاری یاد کی محویتوں نے کھو دیا مجھ کو
اسی درد محبت سے ہوا میں عارفی رسوا   اسی درد محبت نے بنایا با خدا مجھ کو

اس دنیا میں دو قسم کے حالات اور رُخ چل رہے ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کا اور ایک شیطان کا یعنی ایک جنت کا اور ایک دوزخ کا۔ حضرت سید سلیمان ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ نماز کے اندر ہمارا سجدۂ سہو غایت غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدۂ سہو غایت التفات اور انتہائی مشغولیِ الٰہی کے وجہ سے ہوا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات میں اتنے مشغول ہوئے کہ ظاہرِ نماز میں سہو ہوگیا۔ کسی نے کہا ہے ؎

چوں نماز می گزارم بخدا خبر نہ دارم
کہ تمام شد رکوعے یا امام شد فلانے

ترجمہ: جب میں نماز پڑھتا ہوں تو خدا کی قسم اس کا پتہ نہیں چلتا کہ رکوع کب پورا ہوا اور کون امام ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز میں خشوع وخضوع مطلوب ومقصود ہے ارشاد فرمایا

﴿اللّٰھم انی اعوذبك من خشوع النفاق﴾

ترجمہ: اے اللہ میں نفاق والے خشوع سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

نفاق والا خشوع کیا ہے؟ کہ ظاہر میں تو نگاہ جھکی ہوئی ہو لیکن دل کا زاویہ غلط ہو۔ اگر دل کا زاویہ ۹۰

درجہ کا ہو یعنی سیدھا ہو تو اللہ تعالیٰ کا دھیان ہوگا، اور اگر کم یا زیادہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھیان ہٹے گا۔ دل کا زاویہ بھی سیدھا ۹۰ کا ہو، جس طرح کہ قطب نما کی سوئی سیدھی ۹۰ کے درجہ پر شمال کی طرف ہوتی ہے، ایسے ہی اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف ۹۰ درجے کا زاویہ بنا رہا ہو اور اس کو خدا کی ذات کے علاوہ قرار نہ آتا ہو۔ بقول اقبال ؂

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

ہر ایک سے کٹ کٹا چھٹ چھٹا کر ایک اللہ کا ہو جائے یعنی حنیف بن جائے۔ حنیف وہ ہوتا ہے جو نہ غیر کو پاتا ہو، نہ غیر کو چاہتا ہو اور نہ غیر کے ساتھ متعلق ہو۔ غیر کی وابستگی جس نے ختم کی وہ حنیف ہے اور وہ وابستہ بحق ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک شعر ہے ؂

تنہائی کے اب دن ہیں، تنہائی کی اب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

مجمع میں بھی انسان کو تنہائی نصیب ہوتی ہے، باہمہ اور بے ہمہ کی حالت ہوتی ہے۔

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت ان کو — شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اگر انسان کو اللہ کے ساتھ تعلق نصیب نہیں تو یہ دل کی گڑ بڑ ہے۔ ہمارا دل غیر میں اٹکا ہوا ہے۔ حنیفیت سے جب انسان نکلتا ہے تو شرک کی طرف آتا ہے۔ توحید نام ہے... چاہتوں کے، دھیانوں کے اور خیالوں کے ہر ایک چیز سے نکل جانے کا اور اللہ کی ذاتِ عالی پر مرکوز ہو جانے کا۔ شرک اس کے خلاف ہے جتنی چاہت غیر میں منتشر ہوتی جائے گی توحید نکلتی جائے گی۔

توحیدِ تام نام ہے ہر غیر سے اُمیدوں، خواہشوں، مرادوں اور اُمنگوں کے قطع کرنے کا اور اللہ کو مقصود و مطلوب و ماویٰ و ملجا سمجھنے کا۔ جس طرح کمپاس کی سوئی خود بخود شمال کی طرف رہتی ہے اسی طرح تم چاہو یا نہ چاہو دل کے کمپاس کی سوئی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دُعا میں فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِكَ﴾

ترجمہ: اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کیطرف پھیر۔

﴿یا مقلب القلوب فرغ قلبی عن غیرك﴾

ترجمہ: اے دلوں کے پھیرنے والے، ہمارے دلوں کو ہر غیر سے فارغ کر دے۔

اصل مقصود کیا؟ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اپنی طرف جمائے اور غیر سے پھیر دے۔ حنیف وہ ہے کہ زندگی میں جو بھی ہچکولا آئے دل اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔

آس اس در سے ٹوٹتی ہی نہیں   جا کے دیکھا نہ جا کے دیکھ لیا

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم جا کہاں سکتے ہیں؟ حضرت سید صاحبؒ فرماتے ہیں۔

جب میرا مقصود ہے تیری رضا   پھر مجھے اوروں سے کیا کام ہے

بس دل کو اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یاد کو بساؤ۔ ہر غیر سے کٹ جانا اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے رنگ میں رنگ جانا توحید ہے۔ اللہ کا رنگ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا رنگ عبدیتِ تامہ ہے، اور عبدیت تامہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے میسر آتی ہے۔ گویا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جائے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگ جائے۔ اس کا حال، قال، اعمال و اشغال سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہوں۔

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام: ۱۶۲)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔

اگر زندگی ساری کی ساری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر آ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگ جاؤ گے۔ حدیث پاک ہے

مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ (ابی داؤد، مسند احمد)

ترجمہ: جو شخص کسی کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اُن ہی میں سے ہوتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت اختیار کرنے سے کل قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ مل جائے گی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے قیامت کے سخت پیاس والے دن حوضِ کوثر کے جام پینے کے لئے ملیں گے۔ پھر جس جگہ اعمال نامے اُڑائے جائیں گے وہاں بھی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی شفاعت کام آئے گی، پل صراط پر بھی آسانی سے گزر جاؤ گے، اور انشاء اللہ جنت میں بھی داخلہ نصیب ہوگا۔ دل کو بڑھاؤ، دل کیوں ڈانواں ڈول ہے، دل تو حقیقت میں وہی ہے جو دل والے کا ہے۔ اگر یہ دل، دل والے کا یعنی اللہ تعالیٰ کا نہیں تو پھر یہ اکاش وانی (انڈیا ریڈیو، جو دہلی سے خبریں نشر کرتا ہے) ہے جس میں تمام دنیا کا جھوٹ اور گندگی بھری ہوئی ہے۔ ؎

تو ہمی گوئی کہ مارا ہم دل است دل فرازِ عرش باشد نے زیست

ترجمہ: تو بھی یہ کہتا ہے کہ میرا دل ہے! دل تو عرش کی بلندیوں والا ہوتا ہے نہ کہ پستی والا۔

دل کو اللہ تعالیٰ کے ذِکر کا انجکشن لگایا کرو۔ انجکشن رگ میں بھی لگایا جاتا ہے اور پٹھوں میں بھی لگایا جاتا ہے۔ اگر رگ والا انجکشن پٹھوں میں لگا دیا جائے تو وہ جگہ سُوج جائے گی اور اگر صرف اُوپر اُوپر سے کھال میں لگا دیا تو دوائی اندر نہیں جائے گی اور وہ جگہ پھول کر Septic ہو جائے گی۔ اس طرح ایک ذِکر حوالی قلب (دل سے باہر) میں ہوتا ہے اور ایک سودائے قلب (دل کی گہرائی) میں۔ متنبی کا شعر ہے: ؎

عذل العوازل حول القلب التائه وھوی الاحبته منه فی سودائه

متنبّی کہتا ہے کہ ملامت گروں کی ملامت تو دل کے باہر گوشوں میں ہے اور محبوب دل کے اندرونی گوشوں میں۔ ایک ذکر ہم کرتے ہیں جو اُوپر سے بہہ جاتا ہے جیسے گھڑے کے منہ میں پانی نہیں ڈالا اور باہر باہر ڈال دیا۔ تو ذکر کو توجہ کے ساتھ دل میں ڈالو، یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لئے مرشد کا دامن تھامنا پڑے گا کہ دل میں اس کے قلب کے عکس سے اللہ کا تعلق آجائے۔ انجکشن کو اصل مقام پر پہنچاؤ تو تب فائدہ دے گا، اسی طرح ذکر کو بھی اندر پہنچانا ہوتا ہے، ذکر جب اندر پہنچے گا تو جڑ پکڑے گا اور جب جڑ پکڑے گا تو فکر پیدا ہوگی، اور جب فکر پیدا ہوگی تو اللہ کی ذات میں مگن ہو جاؤ گے اور یہ حالت ہوگی ؎

عاشقی چیست بگو بندہ جانان بودن
دل بدست دیگرے دادن وحیران بودن

ترجمہ: عاشقی کیا ہے؟ کہو کہ محبوب کا بندہ اور غلام بن جانا۔ دل دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا اور حیران رہ جانا۔

☆☆☆☆☆

علامہ سید سلیمان ندویؒ

اہل سنت والجماعت (قسط نمبر:۲)

اتنے تو بر تو پردوں کے اٹھنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کی حقیقت پر ایک اور نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔

اختلافاتِ صحابہ اور مختلف فرقوں کی پیدائش:

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے فتنہ سے لے کر اس وقت تک تین فرقے برابر برابر کے قائم ہو گئے تھے۔ علویہ، عثمانیہ، حروریہ یا خوارج، ان کی تعداد تمام ملک میں محدود تھی۔ یہ تینوں فرقے جس اصلِ عظیم، جس صراطِ مستقیم اور جس شاہراہ قدیم کو چھوڑ کر الگ الگ راستوں پر پڑ لئے تھے اسی کا نام ''سنت'' اور اسی کا نام ''جماعت'' تھا۔ اور جو سوادِ اعظم اس راہ پر قدم زن تھا وہی ''اہل السنۃ والجماعۃ'' تھے۔ جنہوں نے ایک طرف مذہبی حیثیت سے ان اصولوں سے جن کی شارع نے تعلیم کی تھی ایک ذرہ ہٹنا گوارا نہیں کیا اور دوسری طرف انتظامی و سیاسی نقطہ سے عامۂ صحابہ، سوادِ اعظم، جمہور اور جماعت کی رائے کے پابند تھے۔ ان تمام خانہ جنگیوں میں کچھ لوگ امیر معاویہؓ کے ساتھ تھے، وہ عثمانیہ تھے۔ کچھ جناب علی مرتضیٰؓ کے ساتھ تھے وہ علویہ تھے، اور کچھ دونوں کو بُرا جانتے تھے، وہ حروری اور خوارج تھے۔ ''اہل السنّت'' وہ تھے جو دونوں میں سے کسی کو بُرا نہیں جانتے تھے اور ان کی اصل نیت پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی حیثیت ان تمام خانہ جنگیوں میں ''ناطرف دار جماعت'' کی تھی۔ اس لیے ''اہل السنّت'' کسی فریق کے طرفدار گروہ کا نام نہ تھا بلکہ ناطرفدار گروہ کا نام تھا، وہ ان خانہ جنگیوں کو مذہبی جنگ نہیں، بلکہ سیاسی جنگ سمجھتے تھے۔ وہ اس کو فتنہ کہتے تھے اور اس میں شرکت پر عدمِ شرکت کو ترجیح دیتے تھے۔

اہل السنّت یعنی ناطرفدار گروہ:

صحابۂ کبار میں سے ان خانہ جنگیوں کے عہد میں ہزاروں صحابہؓ زندہ تھے، لیکن فریق کی حیثیت سے جن کا نام پیش کیا جا سکتا ہے وہ معدودے چند اشخاص تھے، بقیہ سوادِ اعظم ناطرفداری کی حالت میں تھا۔ جو بعض اشخاص فریق کی حیثیت سے اِدھر یا اُدھر شریک تھے، وہ ایک دوسرے کو نعوذ باللہ فاسق یا کافر نہیں سمجھتے تھے، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت علیؓ مرتضیٰ کے سخت طرفدار تھے، وہ حضرت عائشہؓ کی فوج کے مقابل میں اہل کوفہ کو شرکتِ جنگ کے لیے ابھارتے ہیں تو یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں۔

انی اعلم انھا الزوجتہ فی الدنیا و الاخرۃ و لکن اللّٰہ ابتلا کم لتلتبعوہ او ایاھا

ترجمہ: میں جانتا ہوں کہ وہ دنیا میں آپؐ کی بیوی تھیں اور آخرت میں بھی آپؐ کی بیوی رہیں گی یعنی جنتی ہیں لیکن خدا تم کو آزماتا ہے کہ اُن کا ساتھ دیتے ہو یا ان کا دیتے ہو۔

حضرت زبیرؓ کے قاتل نے جب حضرت زبیرؓ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؓ نے فرمایا ''ابن صفیہ کے قاتل کو جہنم کی بشارت ہو''، ہم ہی وہ ہیں جن کی شان میں خدا نے فرمایا ہے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ O (الحجر:۴۷)

ترجمہ: ان (اہل جنت) کے سینوں کی عداوتیں ہم نے دور کردیں اور وہ جنت میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں گے۔

حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے جس قدر سیاسی اختلاف تھا وہ پوشیدہ نہیں لیکن جب علمی و دینی ضرورت پیش آئی تو ان کو اسی بارگاہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ کے مقابل فوج لائی تھیں لیکن دینی ضرورتوں کے موقع پر انہوں نے بھی حضرت علیؓ کے علمی پایہ سے انکار نہیں کیا۔

بہرحال ان روایتوں سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ان بعض چند صحابہؓ میں جو اختلاف تھا، وہ فرقہ بندی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اختلاف رائے کی حیثیت رکھتا تھا، اس بنا پر سوادِ اعظم نے ان خانہ جنگیوں کو ''خطاءِ اجتہادی'' سے تعبیر کیا، قرآن کی جو چند اوپر نیچے کی آیتیں علویہ اور عثمانیہ ہم کو سنا کر رہ گئے تھے وہ پوری آیتیں ہم کو سناتے ہیں۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوْا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ ج فَاِنْ فَآئَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ O اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O (الحجرات:۹)

ترجمہ: اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑیں تو اُنکے درمیان صلح کراؤ اور اگر اس میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے تو اُن میں صلح کراؤ۔ خدا اہل انصاف کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور خدا سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وہ صحابہؓ جو ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے، اسلام کی تباہی پر اُن کے پُر درد کلمات اور زمانہ فتن

کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور نصائح جس حسرت اور افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے، اب تک ان کے پڑھنے سے آنکھیں اشک آلود ہوجاتی ہیں۔ فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ خانہ نشین ہوگئے تھے اور کہتے تھے کہ ''اگر میرے گھر آکر بھی کوئی مجھ پر تلوار چلائے تو میں اپنا ہاتھ اُس پر نہ اُٹھاؤں گا۔'' سہل بن حنیفؓ سے عدم شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو کہا ''میں نے جب بھی اپنی تلوار میان سے نکال کر کندھے پر رکھی تو دفعتہً تمام مشکلیں حل ہوگئیں، لیکن موجودہ مشکلات کی نسبت میں نہیں جانتا کہ کیا کروں''۔ حضرت علیؓ نے ایک بزرگ سے شرکت کی درخواست کی، انہوں نے عرض کی ''میرے دوست اور آپکے چچیرے بھائی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ہے کہ جب ایسا وقت آئے تو لکڑی کی تلوار رکھنا، سو وہ لکڑی کی تلوار لے کر چل سکتا ہوں''۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابو بکرہؓ نے لوگوں کو بتایا کہ ''یہ وہ زمانہ ہے جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے، کھڑے ہونے والا چلنے والے سے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے۔''

چند ایسے صحابہؓ بھی تھے جو اُس زمانہ میں گھروں کو چھوڑ کر گاؤں اور پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ ایسے بھی تھے جو اپنی رائے کے مطابق اِدھر یا اُدھر فوج میں موجود تھے لیکن انہوں نے تلوار نہیں چلائی، احادیث کے ابواب الفتن کو دیکھو تو اس قسم کے واقعات صفحہ صفحہ پر ملیں گے۔

اہل سنت کلام میں:

در راہِ عشق پیرو پشیناں نہ ایم

ایں شیوہ را بطر زِ گرمی کینم ما

گذشتہ اوراق میں ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کی جو تعبیر کی گئی تھی وہ سیاسی فرقوں کے مقابلہ میں تھی لیکن حالات کے انقلاب سے یہی لفظ ایک اور معنی پیدا کرتا ہے جس کو ہم لفظ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا دوسرا دور کہتے ہیں۔

اس دور کی تشریح کے لیے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔

عجم اور عرب کے خصائص ذہنی:

جس طرح اشخاص کے فطری خصائص اور اخلاق ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کی بھی فطری خصوصیتیں اور ان کے طبعی اخلاق ہیں۔ عرب کی قوم فطرتاً سرتاپا عمل ہے، ایران سرتاپا خیال اور تخیل ہے۔ جن

لوگوں کی نظر علمِ کلام کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب تک عربوں کا اختلاط ایرانیوں سے نہیں ہوا عربوں کے ہر قسم کے قوائے عملی زندہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی تقلید و مشابہت سے منع فرمایا تھا، اس کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے قوائے اخلاقی، اسلامیت اور عربیت کے صحیح نمونہ پر قائم رہیں۔ حضرت عمرؓ نے مسلمان سپاہیوں کو ایران کی مہم پر روانہ کیا تھا تو ان کو نصیحت کی تھی کہ ایرانیوں سے آرام طلبی کی تعلیم نہ حاصل کریں۔ غیر قوموں سے مسلمانوں کے تشبہ اور ان کے طرزِ لباس کی تقلید سے بھی اس لئے روکا گیا کہ اسلامیت کا جوہر اس اختلاط اور تشابہ سے برباد نہ ہو جائے۔

<u>کوفہ اور بصرہ کے شہر کیوں اختلافات کے مرکز بنے؟</u>

فتحِ ایران کے بعد عرب و عجم کی حدود پر فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہوئے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر عرب و عجم کے مشترکہ اخلاق و خصائص کی نمائش گاہ بن گئے۔ ان اطراف میں اسلام سے پہلے بھی پارسیوں کے وہ فرقے جن کا مذہب سرکاری مذہب کے موافق نہ تھا اور مجوسیت کے باطل فرقے شمار ہوتے تھے، آباد تھے۔ چونکہ یہ حکومت ایران کی آخری سرحد تھی، اس لیے اُن مذہبی مجرموں کے لیے اس سے بہتر کوئی مامن (جائے امن) نہ تھا۔ عربوں نے فوجی نقطۂ نگاہ سے ان مقامات کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا۔

عرب کی خشک آب و ہوا میں رنگین طبیعتوں کی پرورش کے لیے عراق کے سبزہ زاروں اور دجلہ و فرات کے کناروں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ ان وجوہ سے اس زمانہ میں یہ شہر علم و مذہب اور ادب و تمدن کی دلچسپیوں کے باغ و بہار تھے۔ لیکن عرب و عجم کے رنگ و مذاق میں جو طبعی اختلاف ہے اس کے اُبھرنے کے لیے بھی اس سے بہتر زمین کا کوئی قطعہ نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ و عمل کی فوجی سرزمین اوہام و خیال کی رزم گاہ بن گئی۔

<u>مشاجراتِ صحابہ کے بعد اختلافِ افکار:</u>

لوگ کہتے ہیں کہ رات کو بیماری کی شدت بڑھ جاتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بیماری کی شدت نہیں بلکہ بیمار کے احساس کی شدت بڑھ جاتی ہے، دن کے شور وغل اور حواس کی مصروفیت میں احساس کا کم موقع ملتا ہے، لیکن رات کے خاموش اور غیر مصروف گھنٹوں میں ہمارے احساسات ایک ایک رونگٹے کو ٹٹولتے ہیں، اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔

امام حسنؓ اور امیر معاویہؓ نے جب باہم صلح کر لی، اور لوگوں کو اطمینان سے غور کا موقع ملا، تو ہر گروہ کو اپنے بدن کے زخم جن کے دیکھنے کی پہلے فرصت نہ تھی محسوس ہونے لگے۔ دن کے شور وغل اور حواس کی غافلانہ مصروفیت کے بعد اب شام ہو رہی تھی اور رات کے گھنٹے آرہے تھے، عمل کا دور ختم ہو کر اب تخیل کا دور شروع ہوتا ہے، سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا، اور یہ کوفہ میں پیدا ہوا، کہ ہم اگر حق پر تھے تو دوسرے فریق کی نسبت ہم کیا خیال کریں؟ اور اگر حق پر نہ تھے تو ہم خود مذہبی عدالت میں کیا ٹھہرتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا (النساء:۹۳)

ترجمہ: جس نے کسی مسلمان کو عمداً قتل کیا اُس کی جزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اہلِ سنت کا فیصلہ:

اس بنا پر عثمانیہ اور طرفدارانِ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے کو برسرِ حق سمجھ کر دوسرے کو جہنمی قرار دیتے تھے، علویہ بھی اپنے مخالفین کی نسبت یہی فیصلہ کرتے تھے، خوارج نے کہا کہ دونوں نے جان بوجھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائی اس لیے دونوں جہنمی ہیں۔ اہل السنۃ کا فیصلہ تھا کہ یہ قتلِ عمد نہیں قتلِ خطا ہے، کہ ہر ایک فریق اپنے کو برسرِ حق جان کر اور دوسرے کو برسرِ باطل سمجھ کر مذہباً اور اعتقاداً دوسرے کا خون بہانا جائز اور مباح سمجھتا تھا، اس لیے اس کا فیصلہ اُس کے ہاتھ ہے جو حقیقت حال سے واقف اور نیتوں کے اصل منشاء سے آگاہ ہے۔

بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ کوفہ سے چند لوگ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آئے اور ان سے پوچھا کہ یہ آیت منسوخ ہے؟ فرمایا ''نہیں، یہ آیت آخر میں اُتری ہے اس کو کسی نے منسوخ نہیں کیا''۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا قرآن میں تو یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ اوّل کے لیے دعائے مغفرت کریں، لیکن لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں''۔ ام المؤمنین کا اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ (الحشر:۱۰)

ترجمہ: خداوندا ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے پہلے ہیں معاف کر

یہ حدیثیں بخاری اور مسلم کی کتاب التفسیر میں ہیں، سلف صالحین اور محدثین اہل السنّت نے اصولی حیثیت سے اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے، چنانچہ عقائد کی تمام کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

خوارج کے نزدیک چونکہ یہ قتلِ عمد تھا جو گناہِ کبیرہ ہے، اور جس سے دائمی جہنم کا انسان مستوجب

ہوتا ہے، اور دائمی جہنم کا مستوجب ہونا صرف کافروں کی صفت ہے اس لیے گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، اس نتیجہ نے خارجی مذہب کے اصولِ اوّلیں کی حیثیت اختیار کرلی، اس کے بالمقابل ایک اور فرقہ ہوا جو مرجیۂ کے نام سے مشہور ہوا، اس نے بعض احادیث کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں، گناہ سے مؤمن کسی طرح عذاب کا مستحق نہیں ہوتا ہے، چہ جائے کہ اس سے کفر لازم آئے۔ ایک تیسرا فرقہ مُعتزلہ کا ان دونوں کے بیچ میں پیدا ہوا، جس نے دونوں گذشتہ فریقوں کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کیا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ مؤمن ہے نہ کافر، بلکہ وہ کفر اور ایمان کے بیچ کی منزل میں ہے۔

اہل السنّت پھر آگے بڑھتے ہیں وہ ان فرقوں کی طرح جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے، صرف ایک دو آیت یا حدیث کو لے کر فیصلہ نہیں کرتے، اُن کے سامنے قرآن کی تمام آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وہدایات تھیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار اور روایات تھیں، انہوں نے کہا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کفر لازم نہیں آیا لیکن اس کا مرتکب عذاب کا مستحق ضرور ہو جاتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قدرت ورحمت سے گنہگار کی خطاؤں کو معاف کردے اور اسے عذاب سے بچالے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ بعض لوگ خوارج کے دلائل سن کر خارجی بن گئے، اتفاق سے اُن کا گذر مدینہ میں ہوا، وہاں حضرت جابرؓ سے ملاقات ہوئی، اُن سے پوچھا کہ گنہگار بخشے بھی جائیں گے؟ انہوں نے قیامت کے تمام واقعات اور گنہگاروں کی شفاعت اور مغفرت کی حدیث بیان کی، یہ سن کر ایک کے سوا سب تائب ہوگئے۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک مٹھی کھجوریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان کھجوروں میں برکت کی دعا فرمایئے، آپؐ نے دعا فرمائی، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک تھیلی میں رکھ دیا جس قدر بھی میں ان میں سے خرچ کرتا تھا وہ ختم نہیں ہوتی تھیں، بہت سی مقدار راہِ خدا میں خرچ کی اور ہمیشہ اس میں سے خود کھاتا اور دوسروں کو کھلاتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے روز یہ تھیلی گم ہوگئی۔ اس تھیلی کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک شعر ہے جو آپؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت فرمایا ؎

للناس هم ولی همان فقد الجرب وقتل الشیخ عثمان

ترجمہ: آج سب لوگوں کو ایک غم ہے اور مجھے دو غم ہیں، ایک تھیلی کا گم ہونا اور دوسرے عثمانؓ کا قتل۔

ڈاکٹر اعجاز خٹک

فقیرِ مدینہ

میرے ایک قریبی دوست جناب عالمگیر خان جو کہ چارسدہ کے ایک گاؤں کوٹ ترنو کے رہنے والے ہیں۔گزشتہ حج کے لیے جارہے تھے تو میں نے ان کو اپنی نعت کے تین اشعار دیئے اور یہ تاکید کی کہ یہ اشعار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر میری طرف سے پیش کریں وہ یہ تھے،

دومرہ خواہش دغہ دعا دا مئے پیغام اوایہ
بس شہنشاہ دہ مدینے تہ مئے سلام اوایہ

خواہش لرم چہ مرگ رازی پہ مدینہ کے راشی
دوہ گزہ زئے ورتہ زما ہم دا آرام اوایہ

د مدینے پہ مبارک سفر دئے تلہ قبول شہ
چہ ورنزدے شے د اعجاز ہم ورتہ نام اوایہ

ترجمہ: اتنی خواہش یہ دعا اور یہ پیغام عرض کر دینا، بس شہنشاہ مدینہ کی خدمت میں سلام عرض کر دینا، یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اگر موت آئے تو مدینہ منورہ میں آئے، ان کی خدمت میں میرے لیے مدینہ منورہ میں دوگز جائے آرام کا بھی کہہ دینا، آپ کا مدینے منورہ کی طرف سفر کرنا آپ کو مبارک ہو، جب آپ ان کے قریب ہو جائیں تو اعجاز کا بھی نام لے لینا۔

جناب عالمگیر خان نے مجھے بتایا کہ وہ ہر روز بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں میرے یہ اشعار پڑھتے رہے۔ایک دن وہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اشعار پڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی ان کے قریب آیا اور عالمگیر خان کو کہا کہ یہ اشعار مجھے دے دو۔عالمگیر خان کے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ اس کا نام بھی اعجاز ہے اور وہ ترنگزئی چارسدہ کا رہنے والا ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کی حیثیت سے مامور ہے اور اسکو روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کی خدمت کا موقع بھی مل جاتا ہے۔اس نے کہا کہ وہ یہ نعت روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالی کے اندر پڑھے گا۔پھر میرے دوست حاجی عالمگیر خان نے یہ نعت اس کے حوالے کی۔جب عالمگیر خان نے یہ واقعہ مجھے سنایا تو میری آنکھوں میں بھی تشکر کے آنسو آ گئے۔میں نے پھر اعتراف کے طور پر چند اشعار لکھے جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

معلومیکی چہ قبول زما سلام شو پہ نعتونو مئے خبر خیر الانام شو

لار دہ مینے د بلال حبشیؓ لار — چہ روان شوم پہ منزل راتہ یو گام شو

جورو قبولہ مئے د مور او پلار دعا شوہ — د کامل مرشد خدمت زما انعام شو

چہ درود مئے د دعا سرہ شامل کرو — د نصیب ستورے مئے اوکتو پہ بام شو

چہ ھم فخر الاولین ھم آخرین دے — نبوت راغےپہ دوئی باندے تمام شو

زہ اعجاز د ہ لوئے اللہ شکر گزاریم — د نبی پہ غلامانو کے مئے نام شو

ترجمہ: ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا اسلام قبول ہو گیا ہے، کیونکہ میری نعتوں پر جناب رسول خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم باخبر ہو گئے۔ راستہ حضرت بلال حبشیؓ کا جو کہ محبت کا راستہ ہے جب اس پر میں چل پڑا تو منزل ایک گام ہو گئی۔ ایسے لگتا ہے کہ میرے والدین کی دعا قبول ہو گئی اور اپنے مرشد کامل کی خدمت مجھے انعام دلا گئی۔ جب میں نے درود شریف کو اپنی دعا کے ساتھ شامل کیا تو میں نے دیکھا کہ میری قسمت کا ستارہ بلندی پر پہنچ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فخر الاولین والآخرین ہیں اور نبوت آکر ان پر ختم ہو گئی۔ میں اعجاز اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں شمار ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

(بقیہ صفحہ '۳۲' سے)

اس ساعت میں اس نے ایک ہستی کی پیدائش کی پیشن گوئی کی ہے اور اس ہستی کی جنم پتری یوں لکھی ہے۔

۱) اس شبھ گھڑی (نیک، چمکدار) میں ایک بالک کا جنم ہوگا۔

۲) اس کے پِتا (والد) کی دِھ (وفات) ہو چکی ہوگی۔

۳) وہ ہندیش کے پچھّم (مغرب) میں ہوگا۔

۴) اس سمے وہاں دھونش دھانش (افراتفری) ہوگی۔

۵) وہ نکلنک ہوگا، وہ جگت گرو ہوگا۔ (تحقیقات مولوی مشتاق احمد چشتی)

☆☆☆☆☆

☆ اگر انسان احسان، تصوف، اور نیکی کا ہر کام تو کرلے لیکن اپنی مرغی کو ستاتا ہو تو اسے نیکوکار اور محسن نہ کہیں گے۔

ڈاکٹر قیصر علی

سفرنامۂ مقدونیہ

سابق یوگوسلاویہ کی آزادشدہ ریاست مقدونیہ میں ستمبر تا نومبر ۲۰۰۴ء عرصہ تین ماہ قیام رہا، جس کے کچھ حالات پیش خدمت ہیں۔

۱۹۹۰ء میں جب یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ حکومت روس کے زیراثر باقی کمیونسٹ ممالک کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تو اس کے نتیجے میں مقدونیہ، سربیا، بوسنیا، کروشیا، سلووینیا اور مونٹی نگرو کی ریاستیں وجود میں آئیں۔ کوسووکا ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ مسلم اکثریتی آبادی کی یہ چھوٹی سی ریاست فی الحال اقوام متحدہ کی فوجوں کی زیرنگرانی ہے۔ البانیہ کی آزاد مملکت سمیت ان تمام ریاستوں کو ریاست ہائے بلقان (Balkan States) کہا جاتا ہے۔ مشرقی یورپ کی یہ تمام ریاستیں اٹلی، آسٹریا حتی کہ فرانس کے بعض حصے بھی عثمانی خلافت کے زیرنگیں رہ چکے ہیں۔ بلقان کی ریاستیں ۵۰۰ سال (۱۴۰۰ تا ۱۹۱۰) عثمانیوں کی زیرحکومت رہیں۔ لہٰذا ان علاقوں پر مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ ان کے رسم ورواج، لباس، زبان اور فن تعمیر میں مسلم تہذیب کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ بلقان کی ریاستوں کی کل آبادی ۵۵ ملین (ساڑھے پانچ کروڑ) ہے۔ جس میں مقدونیہ کی بیس لاکھ آبادی میں مسلمانوں کا تناسب تیس فیصد ہے۔ البانیہ اور بوسنیا میں ۷۰ فیصد جبکہ کوسوو میں ۹۰ فیصد مسلمان بستے ہیں۔ باقی ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰ فیصد کے لگ بھگ ہے۔ مسلمان نسلی لحاظ سے اکثر البانوی ہیں، بلکہ ان علاقوں میں مسلمانوں کو مسلمان نہیں بلکہ البانوی کہا جاتا ہے۔ مقدونیہ میں بھی اکثریت البانوی مسلمانوں کی ہے۔ اسی طرح کوسوو میں تقریباً سب کے سب البانوی مسلمان آباد ہیں اور یہ مسلمان البانوی زبان بولتے ہیں۔ مگر بوسنیا میں رہنے والے مسلمانوں کو سربیائی مسلمان کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ مسلمان ہیں جو نسلاً سرب ہیں اور سربیائی زبان بولتے ہیں۔ سربیا کی عیسائی حکومت کی بوسنیائی مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کی وجہ بھی یہ تھی کہ سربیائی عیسائی مسلمانوں کو ایک دوسری قوم کے طور پر ماننے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ جب ہماری نسل، زبان اور ملک ایک ہے تو محض مذہب مختلف ہونے کی وجہ سے ہم تمہیں الگ ملک نہیں دے سکتے۔ بلکہ جن دنوں میں وہاں تھا سننے میں آیا کہ البانیہ میں بھی عیسائی مشنیریوں نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد البانوی مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ آپ لوگ پہلے عیسائی تھے مسلمانوں نے ظلم سے آپ کو مسلمان بنایا ہے لہٰذا آپ اپنے مذہب میں واپس آجائیں۔ اور میں نے کسی سے سنا کہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ان کی تحریک سے متاثر ہورہی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسلام کی مقناطیسیت مسلمانوں کو آسانی سے چھوڑتی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان ریاستوں میں مسلمانوں پر بے تحاشا مظالم ہوئے لیکن پھر بھی اکثریت اپنے دین پر قائم رہی اور بڑی مضبوطی سے قائم رہی۔ بلکہ ان فسادات کے بعد مسلمانوں میں بیداری پیدا

ہوئی، جذبۂ جہاد سے آگاہی ہوئی اور عام طور پر مسلمانوں کی دینی حالت میں بہتری آئی۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

مشرقی یورپ میں عام طور پر اکثریت ''سلاف'' نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ہے، یہ نسل بنیادی طور پر روسیوں (Russian) کی ایک شاخ ہے۔ اور پھر علاقوں کے لحاظ سے مزید کئی فرقوں میں تقسیم ہے۔ بلقان کی ریاستوں میں رہنے والے لوگ اسی ''سلاف'' (Slav) نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر علاقوں کی مناسبت سے یہ سرب، مقدونیائی اور بوسنیائی کہلاتے ہیں البتہ البانوی نسل اس سے جدا ہے۔ بلقان کی ریاستوں میں جگہ جگہ البانوی مسلمان آباد ہیں جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ قوم ترکوں کی وفادار تھی اور ترکوں نے اس کو پورے بلقان میں جگہ جگہ بسانے کی کوششیں کی تھیں تاکہ اگر مقامی عیسائی بغاوت کریں تو یہ لوگ ترکوں کا ساتھ دیں۔ البانویوں کے اپنے علاقے ہیں اور ان میں قلیل تعداد ترکوں کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان ریاستوں میں کچھ لوگ جن کو Gypsies یعنی خانہ بدوش کہا جاتا ہے بھی بستے ہیں۔ بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی ہیں اور بہت عرصہ پہلے یہاں آ بسے ہیں۔ تیسرے درجے کے تمام کام مثلاً نالیوں وغیرہ کی صفائی کا کام ان ہی کے سپرد ہے۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید یہ لوگ مسلمان ہیں لہٰذا اُن کو اس مصیبت میں دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی تھی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان میں سے اکثریت کا تعلق کسی مذہب سے نہیں آزاد منش قسم کے لوگ ہیں۔

تمام ریاستوں حتیٰ کہ مسلم اکثریتی ریاستوں میں بھی حکومت اور اعلیٰ عہدے عیسائیوں کے پاس ہیں۔ میں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کمیونسٹ دور سے ہی مسلمانوں کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ اُس دور میں بھی مقامی عیسائیوں نے مسلمانوں کا ہر طرح سے استحصال کیا تھا۔ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم اور حکومتی عہدوں سے محروم رکھنے کی کوششیں کی گئیں اور اسی کے اثرات یہ ہیں کہ ان علاقوں میں مسلمان عام طور پر کم تعلیم یافتہ، نسبتاً غریب اور کم حیثیت میں ہیں۔ اصلی اقتدار ''سلاف'' نسل کے عیسائیوں کے پاس ہے۔ ان عیسائیوں کا تعلق عیسائی مذہب کے Orthodox فرقے سے ہے جو مسلمانوں سے حد درجہ تعصب رکھتے ہیں۔ گو ان علاقوں میں چالیس سال کمیونزم رہا لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں عیسائیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مذہب سے شغف رکھتی ہے اور میں نے کئی عیسائیوں کو پوری داڑھی رکھے ہوئے دیکھا۔ یہاں عام طور پر عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے پچھلے سالوں میں دونوں کی آپس میں جگہ جگہ لڑائیاں ہوئیں لیکن عیسائی باوجود یہ کہ حکومت میں تھے مسلمانوں کو دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ اکثر جگہوں پر جب مسلمان غالب آنے لگے تو یورپی اور امریکی عیسائی ان کو چھڑانے کے لیے آ گئے۔ اب انھوں نے مجبوراً مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ نمائندگی دی ہے۔

میں جس شہر میں رہتا تھا اُس کا نام سکوپیہ ہے اور یہ مقدونیہ کا دارالحکومت ہے۔ مقدونیہ کی بیس لاکھ آبادی میں سے چھ لاکھ لوگ سکوپیہ میں آباد ہیں جن میں قریباً دو لاکھ کے لگ بھگ مسلمان ہیں۔ اس شہر کے وسط میں ایک نہر گزرتی ہے جس کا نام وردار (Verdar) ہے، اس نہر کے ایک جانب پرانے شہر میں تمام کے تمام مسلمان آباد ہیں جبکہ دوسری جانب عیسائی ہیں اور دونوں علاقے باوجود ایک شہر کا حصہ ہونے کے کافی مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے علاقہ میں کافی مساجد ہیں جن میں سے اکثر ترکوں کے وقت کی بنی ہوئی (۲۰۰ سے لے کر ۵۰۰ سال تک پرانی) ہیں۔ اکثر لوگ چھوٹے چھوٹے گھروں میں درمیانی درجے یا غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گلی کوچوں میں نکاسی کا نظام فرسودہ ہے اور مجموعی طور پر یہ علاقہ یورپی معیار کے لحاظ سے کافی پسماندہ دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ عیسائیوں کا علاقہ یورپ کے کسی بھی شہر کی طرح خوبصورت اور صاف ستھرا ہے۔ بدقسمتی سے میری رہائش عیسائیوں کے علاقے میں تھی، اس لیے مجھے نماز کے لیے تقریباً چالیس منٹ پیدل چل کر جانا پڑتا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بہت سے عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے علاقوں میں بالکل نہیں جاتے یا بہت ہی کم جاتے ہیں۔ مثلاً میں جس مسجد میں نماز پڑھتا تھا وہاں ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ ۱۰ سال یا اس سے بھی زیادہ ہوئے ہونگے کہ میں پُل کے اُس پار نہیں گیا ہوں۔ Verdar نہر کے پل پر کھڑے ہو کر آپ دونوں طرف کے علاقوں کا فرق بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔ میں ہر رات اس پل پر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر کے لیے دونوں طرف دیکھتا اور پھر Verdar نہر سے باتیں کرتے ہوئے مسلمانوں کے علاقے میں جاتا۔ میں Verdar سے عثمانی مسلمانوں کی عروج اور ترقی کے دور کے حالات پوچھتا لیکن Verdar خاموش رہتا۔ اس بات کا البتہ مجھے پکا یقین تھا کہ Verdar اُس دور میں زیادہ خوش ہوتا ہوگا جب مسلمان یورپ کے دل پر حکومت کر کے اسلام کا بول بالا کر رہے تھے اور شہر کے دونوں جانب ''اللہ اکبر'' کی آوازیں گونجتی ہونگی۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ ترکوں کے وقت میں دونوں جانب مساجد آباد تھیں اور اُس وقت یعنی تقریباً ۱۰۰ سال پہلے تک صرف اس شہر میں ۱۲۵ کے قریب مساجد تھیں جن میں سے اب صرف ۲۲ مساجد رہ گئی ہیں۔ بندہ کو قریباً ان سب مساجد میں نماز پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں ترکوں نے ایک عظیم الشان مسجد بنوائی تھی لیکن ترکوں کے جانے کے بعد عیسائیوں نے وہ مسجد شہید کر دی اور اُس پر ایک فوجی کلب بنا لیا لیکن کلب مکمل ہوتے ہی ایک زلزلہ آیا اور پورا کلب زمین بوس ہو گیا۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے اُس جگہ ہوٹل اور پلازے وغیرہ تعمیر کرنا چاہے لیکن کوئی نہ کوئی قدرتی آفت ان کو اس سے روک دیتی اور تا حال وہ جگہ شہر کے وسط میں Verdar کے کنارے بالکل خالی پڑی ہے۔ جبکہ اس کے دونوں اطراف میں اونچے اونچے پلازے اور ہوٹل آباد ہیں۔ میں نے وہ جگہ خصوصی طور پر معلوم کی اور اُس میں الحمد للہ دو رکعت نفل بھی پڑھے۔

میں جس ادارے کے ساتھ کام کر رہا تھا اُس میں تقریباً ۳۰۰ کے قریب پروفیسر زلزلوں پر تحقیقی کام کر رہے

تھے، لیکن اُن میں سے ایک بھی مسلمان نہیں تھا صرف ایک خاتون جو ایک پروفیسر کے ساتھ اسسٹنٹ (Assistant) تھی اُس کے متعلق آخر میں پتہ چلا کہ مسلمان ہے۔ چونکہ میں عید الفطر میں بھی وہاں ہی تھا۔ عید کے دوسرے دن میں اُس پروفیسر کے دفتر میں کسی کام کی غرض سے گیا تو اُس خاتون نے مجھے کہا کہ میں مسلمان ہوں (کچھ نام بتایا جو میں بھول گیا۔) میں نے عید الفطر کے موقع پر آپ کے لیے خاص طور پر ایک قسم کا حلوہ بنایا ہے جس کو ہم مقامی زبان میں ''بکلاوہ'' کہتے ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟ تو اُس نے جواب دیا کہ آپ کی داڑھی اور لباس کی وجہ سے سینکڑوں لوگوں میں بھی آپ کو نظر انداز نہیں کیا سکتا، میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں عید الفطر پر آپ کو ''بکلاوہ'' ضرور کھلاؤں گی۔

میری طرح قریباً پندرہ اور ملکوں کے لوگ بھی اس ادارے میں کام کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ ان میں البانیہ کا ایک نوجوان مسلمان انجینئر بھی تھا۔ جب میں نے اُس سے البانیہ کے حالات جاننا چاہے تو اُس نے کہا میرا نام Erald Karluko ہے، میرے والد کا نام رضا ہے اور وہ چھوٹی موٹی ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے۔ میری والدہ جج ہے۔ میرا ایک اور بھائی ہے جو پولیس میں نوکری کرتا ہے۔ میرے والد نے میرا نام یورپی لوگوں کی طرح اس لیے رکھا ہے کہ مسلمان ناموں والے لوگوں کو دقیانوسی خیال کیا جاتا ہے۔ کمیونزم کے دور کے واقعات بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ سکولوں، کالجوں، ٹی وی اور اخبارات میں ہر جگہ یہ بتایا جاتا تھا کہ تمہارا مذہب کمیونزم ہے، جس کی بنیاد ڈارون کا نظریہ ہے جس کی رو سے انسان ارتقاء کے منازل طے کرتا ہوا بندر سے وجود میں آیا ہے۔ میں جب ۷، ۸ سال کا ہوا تو میں نے اپنے دادا کو تہہ خانے میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ میرے والد اور چچا بھی اُن کے ساتھ ہوتے۔ میں والد سے پوچھتا کہ آپ لوگ یہ کیا کرتے ہیں؟ تو وہ جواب دیتے کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ ہم نماز پڑھتے ہیں۔ پھر میں پوچھتا کہ آپ تو مسلمان ہیں لیکن میں کیا ہوں؟ تو والد صاحب ہنس کر جواب دیتے کہ تم بھی مسلمان ہو۔ بس مجھے اتنا ہی پتہ تھا۔ والد مجھے کلمہ، نماز کا سبق وغیرہ سکھاتے۔

کمیونزم کے آخری دور (۸۰ کی دہائی) میں ہمارے ملک پر ایسا وقت آیا کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ حکومت نے اعلان کیا کہ آلو کو بطور روٹی اور سبزی دونوں کیکھایا جائے۔ پورے مہینے میں ہر خاندان کو آدھا لیٹر تیل، چار کلو گوشت اور کچھ سبزی ملتی۔ مالدار سے مالدار آدمی کے پاس چار سے زائد جوڑے نہیں ہوتے تھے۔ کمیونزم تب ختم ہوا جب لوگ بالکل بھوکوں مرنے لگے۔ روس ٹوٹ گیا تو لوگوں کی جان چھوٹی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ کمیونزم چاہتے تھے تو کہنے لگا.... اُنھیں ہمارے حالات سنائیں۔ کمیونزم کا وقت ہمارے لیے ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ اُن دنوں جو گوشت ہمیں ملتا تھا وہ سور کا گوشت تھا کیونکہ سور کا گوشت باہر سے بند پیکٹوں میں آتا تھا اور وہ گائے اور مرغی کے گوشت سے سستا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے میرے دادا بہت پریشان رہتے کیونکہ وہ سور کا گوشت نہیں

کھاتے تھے۔خدا کا کرنا کیا ہوا کہ کچھ عرصہ بعد پورے ملک میں ایک بیماری پھیل گئی جس میں پیٹ کا درد ہوتا اور پاخانے میں کیڑے آتے۔ڈاکٹروں نے اس بیماری کی وجہ سور کا گوشت قرار دیا جس پر حکومت نے اُس گوشت پر پابندی لگادی۔کمیونزم ختم ہونے کے بعد اب لوگ مساجد کو جاتے ہیں۔اذان لاؤڈسپیکر میں ادا کرتے ہیں اور کافی حد تک مسلمانوں میں اپنے مذہب سے آگاہی پیدا ہوئی ہے۔خاص طور پر جب بلقان کی ریاستوں میں خانہ جنگی ہوئی اور مذہب کے نام پر قتل و غارت شروع ہوا تو لوگوں میں مزید شعور بیدار ہوا۔پہلے ایک عیسائی اور مسلمان میں صرف نام کا فرق ہوتا تھا لیکن اب پتہ چلا کہ فرق بہت ہے۔مسلمان اُس دور میں منظّم ہوئے اور اکثر لڑائیوں میں عیسائی حملہ آوروں کی خوب خبر لی۔

میں نے موجودہ حالت کے بارے میں پوچھا....تو بتایا کہ کمیونزم اور لادینیت کے اثرات اتنی جلدی ختم نہیں ہونگے۔ یہ علاقہ یورپ کا دروازہ ہے۔کوئی یورپی ملک یا امریکہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ یہاں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی حکومت ہو اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود حکومت اقلیتی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اخلاقی حالت یہ ہے کہ بدکاری اور شراب کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔میرا بھی یہی حال ہے، آپ کو پتہ ہے میں کیوں شادی نہیں کرنا چاہتا؟ اس وجہ سے کہ میرا نہیں خیال کہ پورے البانیہ میں مجھے کوئی کنواری لڑکی مل سکے گی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ دوسری عورتوں کی زندگی برباد کرتے ہیں تو آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ آپ کو ایک پاک لڑکی مل جائے۔ کہنے لگا کہ ہاں میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں لیکن ہم کیا کریں یہ چیزیں ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکی ہیں۔اگر میری بہن رات ۲ بجے گھر آجائے تو والدین اُس سے نہیں پوچھ سکتے کہ تم کہاں تھی؟ عورتوں کا لباس بالکل برائے نام ہے، پنڈلی چھپانی والی عورت کو دقیانوسی خیال کیا جاتا ہے۔سکرٹ کا وقت گزر چکا ہے اب نئی چیزیں آگئی ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود کچھ گنے چنے لوگ دین پھیلانے کا کام کر رہے ہیں جس سے خصوصاً دیہاتوں میں کافی فرق پڑ رہا ہے۔آخر میں کہنے لگا کہ مجھے پتہ نہیں آگے کیا ہوگا کیونکہ بے حیائی اور عریانی کا طوفان جس رفتار سے معاشرے کو نگل رہا ہے شاید ہی یہ لوگ اس کے سامنے بند باندھ سکیں۔ ایک دن ہم دونوں نے اپنے کمرے میں جماعت کی نماز پڑھی۔عشاء کا وقت تھا، جب فرض پڑھ لیے تو مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کروں؟ کیونکہ میں کبھی کبھار عشاء کی نماز پڑھتا ہوں۔ان سب کمزوریوں کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اس پر فخر کرتے ہیں اور اس کے لیے جان کی قربانی کا وقت آجائے تو اس سے دریغ نہیں کرتے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کلمہ میں کیا آگ بھری ہوئی ہے کہ محض زبان سے اس کے پڑھنے والے جن کا باقی کوئی عمل بھی مسلمانوں کی طرح نہیں اُن کا یہ حال ہے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆

حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہ

اصلاحی مجلس

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلیٰ رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ:

دورِ جدید میں جو بے دینی اور کمزوریاں آئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ آدمی صاحب نصاب ہوتا ہے اور حج کرنے کی اس کو فکر نہیں ہوتی۔ یہ کوئی ضعیف سا مسئلہ ہے کہ زندگی میں ایک بار حج کرنا ہے۔ حج ایک بار کرنا تو فرض ہے۔ پھر اس میں تاخیر کرنا اور مؤخر نہ کرنا اس پر پوری بحث ہے اور راجح موقف مؤخر نہ کرنے کا ہے۔ تو جس سال حج فرض ہو گیا اسی سال کرنا چاہئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے

مَنۡ مَلَکَ زَادًا وَرَاحِلَۃً تُبَلِّغُہٗ اِلیٰ بَیۡتِ اللّٰہِ وَ لَمۡ یَحُجَّ فَلَا عَلَیۡہِ اَنۡ یَمُوۡتَ یَھُوۡدِیًا اَوۡ نَصۡرَانِیًا (الترمذی)

ترجمہ: جو کوئی اتنا زادِ راہ اور سواری رکھتا ہو کہ اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکے اور پھر بھی وہ حج کے لیے نہ جائے، تو کوئی حرج نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔

بعض لوگ مشکلات میں گھرے ہوتے ہیں اس کی بنیاد کسی نہ کسی جگہ پر عمل میں کوتاہی ہوتی ہے۔

ظَھَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ (الروم:۴۱)

ترجمہ: خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں۔

بعض اوقات اس طرح کے مصائب فرض حج ترک ہونے کی وجہ سے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر صاحب بندہ کے شیخ کے پاس آئے اور کہا کہ میرے علاقے میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ مجھے مجبوراً تبدیلی کرانا پڑی کیونکہ جان خطرے میں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ پر حج تو فرض نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ حج تو مجھ پر فرض ہے، میں نے کہا کہ آپ حج نہ کرنے کے وبال میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ ہم اصلاحِ نفس اور قربِ خداوندی بیان کرتے ہیں اپنی مجالس میں جو مقصودِ تصوف ہے، قربِ الٰہی کے لیے عام طور پر تصوف میں نوافل اور اذکار کی کثرت کرائی جاتی ہے لیکن محققین صوفیاء جانتے ہیں کہ یہ کثرت فرائض اور واجبات پورا ہونے کے بعد ہے۔ صوفیاء میں محققین اور غیر محققین دو قسم کے گروہ ہیں۔ محققین انھیں کہتے ہیں جس طرح کہ کوالیفائڈ ڈاکٹر ہو، اور غیر محققین جس طرح کہ عطائی (quack) ہو۔ تو مستند اور عطائی ڈاکٹر صاحبان ہوتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے پوچھا، غالباً مواعظ میں ہے، کہ حضرت کوئی خاص فرق تو نہیں ہے، حکیم فلانا بھی علاج کرتا ہے اور پنساری فلانا بھی علاج کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں حکیم اور

پنساری ہوتے تھے۔ حکیم وہ ہوتا تھا جو مستند ہوتا تھا، بیماریوں کو جانتا تھا، تشخیص کو جانتا تھا، علاج کو جانتا تھا اور پنساری وہ ہوتا تھا جس نے صرف جڑی بوٹیاں اور معجون وغیرہ رکھے ہوتے تھے۔ پنساری بھی علاج کرتا ہے اور حکیم بھی علاج کرتا ہے، حکیم کے آدمی بھی ٹھیک ہوجاتے ہیں اور پنساری کے آدمی بھی ٹھیک ہوجاتے ہیں ۔کبھی حکیم کا آدمی بھی مرجاتا ہے اور کبھی پنساری کا بھی مرجاتا ہے، تو کوئی خاص فرق تو نہ ہوا۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا بڑا فرق ہے، فرق یہ ہے کہ جو مستند ہے اس سے اگر آدمی مرے گا تو اس کی پکڑ نہیں ہے وہ گنہگار نہیں ہے اور جو غیر مستند ہے اس سے جب آدمی مرے گا تو اس کی پکڑ ہوگی اور یہ گنہگار ہوگا۔ جب مستند حکیم نے اپنا علم صحیح طرح استعمال کیا، اپنی محنت کی، غور کیا، فکر کی، مریض کا علاج کیا اور پھر مریض مرگیا تو یہ بشری خطاء ہوگئی، انسانوں کی بشری خطاء کو شریعت مانتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے ایک حکیم صاحب تھے انھوں نے ایک مریض کو غلطی سے علاج والی گولی کھلانے کی بجائے چوہوں کو مارنے والی گولی کھلادی، اور جب کھلائی تو بس آدمی کی موت ہوگئی۔ بشری خطاء کو اللہ تعالیٰ نے تسلیم کیا ہے، اس لیے فتوے میں اور علاج دونوں میں بشری خطاء کو شریعت نے مانا ہوا ہے۔ اگر فتویٰ دینے والا مفتی تھا، اس کا علم صحیح تھا، مشق اس کی پوری تھی، اس نے خوب دھیان سے فتویٰ لکھ کر دیا لیکن اس سے چوک ہوگئی خطاء ہوگئی اور اگلے آدمی نے اس پر عمل کرلیا تو نہ فتویٰ دینے والا گنہگار رہے نہ عمل کرنے والا گنہگار رہے۔ ہاں جب خطاء کا پتہ چل گیا، اور ندامت ہوگئی اور آدمی توبہ تائب ہوگیا اور اگلے آدمی کو اطلاع کردی کہ مجھ سے فتویٰ غلط ہوگیا تھا آپ اپنے عمل کو درست کرلیں، تو دونوں گرفت میں نہیں ہیں۔ فتویٰ دینے کا عجیب اُصول ہے۔ بہت بھوک لگی ہوئی ہو اس حال میں آپ فتویٰ نہیں دیں گے، بہت تھکاوٹ ہو، زور کا پیشاب آیا ہوا ہو یا قضائے حاجت کا تقاضہ ہو اس حال میں فتویٰ نہیں دیں گے۔ مفتی کو فتویٰ اپنی مسند پر دفتر میں بیٹھ کر دینا چاہیے۔ مفتی کا کتب خانہ ہوتا ہے اس میں بیٹھ کر اطمینان سے فتویٰ دینا چاہیے، کھڑے کھڑے، چلتے چلتے فتویٰ نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس حال میں ذہن مکمل حاضر نہیں ہوتا۔ جمعے کی تقریر کر کے جب میں روانہ ہوتا ہوں تو کوئی آدمی کہتا ہے ایک سوال ہے جی، اب میں سوچتا ہوں کہ یا اللہ ذہن نے کام کرلیا، اب ذہن کی مزید غور کرنے کی استعداد ہی نہ رہی، جتنی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اتنا آدمی کے کام کرنے کی استعداد (stamina) کم ہوتی جاتی ہے۔ اب ایک گھنٹہ میں نے دماغی کام کرلیا، تو اب تین چار گھنٹے آرام کی ضرورت ہے تاکہ پھر سے ذہن کام کرنے کے لیے تیار ہوجائے، نوجوانوں والی بات تو نہیں ہوتی کہ ہر وقت کبڈی کے لیے تیار ہیں۔ تو آدمی نے ساری احتیاطیں برتی ہوئی ہوں پھر بھی غلطی

اور خطاء ہوگئی، تو بشری خطاء پر اللہ تعالیٰ کی پکڑ نہیں ہے۔ اس میں حضرت تھانویؒ نے ایک اور بات لکھی ہوئی ہے، (رفعت عن امتی خطاء و نسیان) میری اُمت سے خطاء اور نسیان کو اٹھایا ہوا ہے، یعنی اس پر پکڑ نہیں کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے فرمایا کہ آدمی نسیان اور خطاء کو کنٹرول نہیں کرسکتا ہے لیکن اسبابِ خطاء ونسیان کو قابو کرسکتا ہے۔ تو یہ میں نے احتیاطیں بتائیں، ان کو برتے بغیر مفتی نے فتویٰ دے دیا تو اس سے خطاء ہوسکتی ہے، یعنی تھکاوٹ ہو، زور کا پیشاب آیا ہوا ہو، بھوک لگی ہوئی ہو، بے اطمینانی کا حال ہو وغیرہ۔ خیر یہ اسباب کی بات تھی کہ خطاء ونسیان کے اسباب کو آدمی کنٹرول کرسکتا ہے۔ جب آپ ایسی حالت میں ہیں کہ آپ سے خطاء ونسیان ہوسکتی ہے تو اس وقت آپ کو کام نہیں کرنا چاہئے۔ آج ہی میں اپنے بیٹے کی کالج والوں کی طرف سے ایک شکایت کے سلسلے میں شہر جا رہا تھا تو گاڑی چلانے کے لیے میں نے ڈرائیور ساتھ لیا، کیونکہ میں نے سوچا کہ میں پریشانی کے حال میں (Under Tension) ہوں، اور ہماری عمر میں قویٰ (reflexes) بھی اتنا کام نہیں کرتے، تو خدانخواستہ کسی سے ٹکر نہ ہوجائے۔ خطاء اور نسیان کے اسباب کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے اور اسے کنٹرول کرنا چاہئے۔

دراصل ہمارا برخوردار اپنے کالج میں اصلاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے فساد کھڑا کردیا، اصلاح تو اُس نے کرنی ہے جس کی کارکردگی سے اصلاح ہوجائے جس کی کارکردگی سے اصلاح نہیں ہوتی ہے اور فساد پیدا ہوتا ہے تو اس کے ذمے تو عنداللہ اصلاح واجب ہی نہیں ہے۔ میں کسی جگہ جاکر حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہاں حالات اور خراب ہوجاتے ہیں، مثلاً میں کسی جگہ ڈھول باجے روکنے کے لیے گیا، وہ تو رکے نہیں اور خدانخواستہ کوئی قتل ہوگیا یا فوجداری ہوگئی، تو اب بتائیں میں نے اصلاح کی یا میں نے فساد پھیلایا۔ تو ایسے آدمی کے ذمے ہے ہی نہیں جس سے اصلاح ہونے کی بجائے اور فساد ہوجائے۔ ایسے آدمی کو اس بُرے عمل کو دل میں بُرا سمجھتے ہوئے ان کے لیے دُعا کرنی چاہئے، عمل سے نفرت وعداوت رکھیں اور عمل والوں سے نفرت نہ کریں، ان کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح فرمادیں۔ بڑی باریک بات ہوتی ہے کہ آدمی اس بُرائی کو روک رہا ہوتا ہے لیکن نفس کے غصے کے جذبے کو مطمئن کرنے کے لیے اور دوسرے کو گھٹیا اور ذلیل کرنے کے لیے اور اپنی بہادری اور کروفر کو ثابت کرنے کے لیے۔ یہ نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ یہاں تو نیت اور بنیاد ہی فاسد ہے۔ ایک مولوی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا یہ بے پردہ عورتیں ان کی ایسی تیسی ان کو پکڑو اور ان کو ٹھیک کرو، دیہاتی لوگوں کو اس بات سے بڑا مزہ آیا لیکن جن کی عورتیں بے پردہ

پھرتی تھیں ان کو بہت ناگوار لگا کیونکہ یہ طرز طنز اور تنقید کا تھا جس کا ردعمل ناگوار ہوتا ہے۔ یہ اصلاح اور خیر خواہی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت قاضی زاہد الحسینی صاحبؒ تھے، درس دے رہے تھے، بہت بڑی شخصیت، بہت بڑے عالم اور اللہ کے تعلق والے۔ تو اس میں عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں، تو چونکہ اسلامیات کے ریٹائرڈ پروفیسر تھے اس لیے پڑھے لکھے لوگ اور عورتیں درس میں آتی رہتی تھیں۔ تو انھوں نے کہا کہ میری بچیاں کچھ آئی ہوئی ہیں اور پردہ نہیں کر رہی ہیں، دیکھیے اس کا بہت بڑا نقصان ہے اور سب کی خدمت میں میری طرف سے درخواست ہے کہ پردہ کیا کریں اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو بہت برکتیں اور رحمتیں نصیب فرمائے اس پر عمل کرلیں تو بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ تو سب کو بہت ندامت ہوئی سب نے کہا بالکل ٹھیک ہے ہم پردہ کریں گی۔ یہ طریقہ حق ہے اور نیت حق ہے۔ جب طریقہ فاسد ہوتا ہے اور نیت فاسد ہوتی ہے تو اس سے اثرات بُرے آتے ہیں۔

محقق اور غیر محقق کی بات ہو رہی تھی۔ غیر محقق جو ہوتا ہے وہ نوافل اور مستحب اعمال میں کوشش کر رہا ہوتا ہے جبکہ محققین کو پتہ ہوتا ہے کہ قرب کا سب سے بڑا ذریعہ ارکان وفرائض کو پورا کرنے میں ہے، اور حرام و کبیرہ گناہ سے بچنے میں ہے۔ حرام اور کبیرہ گناہوں سے بچ کر ارکان وفرائض کو پورا کرنا یہ سب سے زیادہ قربِ الٰہی کا راستہ ہے، اور سب سے تیز رفتار اس میں ہے۔ اس کو کرنے کے بعد پھر نوافل کی کوشش ہے، وہ پھر اور قرب کو بڑھاتی ہے۔ نوافل کو تو لازم کیا نہیں گیا ہے۔ فرائض اور ارکان کی کمی نوافل نہیں پورا کرسکتے۔ یہ عام اُصول جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ ستر نوافل کو ایک فرض کے بدلے میں شمار کیا گیا ہے۔ کسی نے ایک فرض میں کوتاہی کی ہوئی ہے تو ستر نوافل مل کر اس کا ازالہ کریں گے۔ اس اُصول کو سامنے رکھا جائے تو زکوٰۃ کے اور فرض صدقات کا ایک روپیہ ادا نہ کرنے کا نقصان ستر روپے نفلی صدقہ سے پورا کیا جائے گا۔ تو آدمی نماز میں، زکوٰۃ میں، حج میں اور روزے میں کیوں کوتاہی کرے جبکہ یہ قربِ خداوندی کا سب سے قریبی، موثر اور شارٹ کٹ راستہ ہے۔ فرض نماز کا جماعت سے اور تکبیرِ اولیٰ سے ہونا، زکوٰۃ کا پورا ادا ہونا، حج فرض ہے تو اس کا مکمل کرنا، اس لیے کہتے ہیں کہ اہلِ علم کا تھوڑا عمل بہت اجر وثواب دِلانے والا ہوتا ہے۔ اور عابد گو اس کی بڑی عبادت ہو لیکن علم نہ ہو تو اس کی بہت زیادہ محنت اس کو تھوڑا دلاتی ہے۔ تو اپنے وقت کو کس عمل میں استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ اجر لینا چاہیے اس کا عابد کو تجربہ نہیں ہوتا، اس کا فہم نہیں ہوتا کہ کیا چیز، کون سی بات کتنی اہم ہے تو اس سے آدمی نقصان اُٹھا لیتا ہے۔ ایک آدمی زکوٰۃ عشر نہیں دے رہا اور نفل حج کے لیے جا رہا ہے۔

اب جو اس نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ نفل حج پر خرچ کیا اگر اس نے بیس ہزار زکوٰۃ ادا نہیں کی ہوئی اور تیس ہزار عشر ادا نہیں کیا ہوا تو اس پچاس ہزار کی کمی کو نفل حج پورا نہیں کر سکتا۔ ہمارے گاؤں کا کیس ہے، ہمارے محلے کا ایک آدمی تھا کینسر سے اس کی وفات ہوگئی، اس کا گجرانوالہ میں کاروبار تھا کافی پیسے اس کے ذمے قرض رہ رہے تھے۔اس کی برادری نے ایک بچھڑا ذبح کر کے خیرات کی۔ میں نے کہا کہ آدمی تو مقروض تھا، اگر اس کے کوئی پیسے تھے خیرات کے آٹھ دس ہزار روپے تھے تو قرض والوں کو دینے چاہیے تھے۔ جواب ملا کہ قرض تو نہیں لوٹایا اور خیرات کی ہوئی ہے کیونکہ جو خیرات نہیں کرتا تو گاؤں میں شلوار اُترتی ہے یعنی بہت بے عزتی ہوتی ہے۔تو بے عزتی سے جان چھڑانے کے لیے خیرات کر رہے ہیں، اللہ کی رضا کے لیے نہیں۔ اگر اللہ کی رضا کے لیے ہوتی تو قرضہ جو فرض واجب تھا اس کو ادا کرتے۔ سچ بات ہے ہماری باتیں نمود و نمائش کے لیے ہوتی ہیں، اللہ معاف کرے خیرات بھی نمود و نمائش کے لیے، قربانی بھی نمود و نمائش کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی کے والد صاحب حج پر گئے ہوئے تھے، تو ان کے ساتھ قبائلی علاقے کے ایک مَلک صاحب بھی تھے۔ جب حج ہوگیا تو ملک صاحب گھر والوں کو خط لکھ رہا تھا کہ فلانی تاریخ کو میں پہنچ رہا ہوں، پچھلے سال فلانے مَلک کا جو استقبال ہوا تھا اتنا استقبال اگر میرا نہ ہوا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ گلستان میں سعدیؒ کے تہجد کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت سعدیؒ کہتے ہیں کہ نوعمری میں میں والد صاحبؒ کے ساتھ تھا، والد صاحب اور میں نمازِ تہجد کے لیے اُٹھے اور باقی دو تین آدمی سوئے ہوئے تھے۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ یہ تو پہلو ہی نہیں بدل رہے ہیں، تہجد کے لیے اُٹھتے ہی نہیں اگر اُٹھ کر دو رکعت پڑھ لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔تو سعدیؒ کہتے ہیں کہ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ کاش تو بھی نہ اُٹھا ہوتا تو اچھا ہوتا کہ اس اٹھنے سے تو نے اپنے آپ کو ان سے اتنا بہتر سمجھ لیا کہ ان پر طنز کر رہا ہے کہ سوئے ہوئے ہیں اٹھتے ہی نہیں۔تو فرض واجب کو ہم پورا نہیں کرتے، اور نوافل اوّل تو اگر صحیح نیت کے ساتھ بھی ہوں تو فرض اور واجب کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ اور وہ جو ہمارے نوافل وغیرہ فاسد نیت سے ہوتے ہیں تو محض شیطان کے راستے پر سب کچھ چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تصوف خوش خلقی ہی کا نام ہے، جو تم سے خوش خلقی میں بڑھا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ وہ تصوف میں بھی تم سے بڑھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبید اللہ،
خلیفہ حضرت ڈاکٹر فدا محمد

سنت، مستحب، مندوب، ادب

(تعریفات، احکام اوران کی محسوسات میں مثال)

سنت:

لغت میں روش، طریقہ اور عادت کو کہتے ہیں، اچھا ہو یا برا۔ اصطلاحِ شریعت میں سنت دین اسلام کے اس جاری طریقے کو کہتے ہیں جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واجب کیے بغیر ہیشگی کے ساتھ عمل کیا ہو لیکن اس کو گاہے گاہے بغیر عذر کے چھوڑا بھی ہو، خواہ وہ فعل عبادت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو خواہ عادت سے۔

واجب کیے بغیر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس کے چھوڑنے والے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت کی ہو اور نہ اس کے چھوڑنے پر عذاب کی دھمکی دی ہو۔

اب اگر وہ فعل عبادات سے تعلق رکھتا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہیشگی کے ساتھ عمل کیا ہو اور بغیر عذر کے صرف ایک دو مرتبہ ترک کیا ہو تو وہ سنت مؤکدہ ہے (طحطاوی علی مراقی الفلاح) اور اگر دو مرتبہ سے زیادہ ترک کیا ہو تو سنت غیر مؤکدہ ہے۔

اگر وہ فعل عادات سے تعلق رکھتا ہو تو سنت غیر مؤکدہ ہے اگر چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہیشگی کے ساتھ عمل کیا ہو۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کے اقوال وافعال بھی سنت ہی کا مرتبہ رکھتے ہیں بشرطیکہ اجتہادی اُمور نہ ہوں۔ (ایضاح الایضاح ص ۹ لمولانا محمد میاں رحمہ اللہ)

سنت مؤکدہ کو سنت ھدیٰ بھی کہتے ہیں یعنی ان پر عمل کرنا ھدایت کی تکمیل کا سبب اور ان کا چھوڑنا ناپسندیدہ اور گناہ ہے۔ جب کہ سنت غیر مؤکدہ کو سنت زائدہ بھی کہتے ہیں۔

سنت مؤکدہ کا حکم: سنت مؤکدہ کا حکم بھی عمل کے اعتبار سے واجب کا ہے یعنی اس کا کرنے والا مستحق تعریف وثواب اور نہ کرنے والا مستحق ملامت وعتاب اور بغیر عذر کے اصرار کے ساتھ ترک کرنے والا گنہگار اور فاسق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رہے گا۔ اور اگر اس سنت کی حیثیت شعائر کی ہو تو ساری جماعت کے ترک کر دینے پر ان سے قتال واجب ہے، جیسے کہ اذان شعائر اسلام میں سے ہے اس کے ترک پر اسلامی حکومت پر قتال واجب ہے۔ (اُصول فقہ لمولانا محمد عبید اللہ الاسعدی) جماعت کی نماز، تراویح کی جماعت،

اسلامی شکل وصورت بھی سنن شعائر میں سے ہیں۔

سنت غیر مؤکدہ کا حکم: اس کا کرنے والا ثواب کا مستحق ہے اور چھوڑنے والا عذاب کا مستحق نہیں ہے۔

مستحب: اصولیین یعنی علمائے اُصولِ فقہ کے نزدیک مستحب، مندوب، ادب، فضیلت سب ایک ہی چیز ہے، لیکن فقہاء کے نزدیک ان میں فرق ہے۔

لغت میں مستحب محبوب (ضدِ مکروہ) چیز کو کہتے ہیں۔

فقہاء کی اصطلاح میں مستحب وہ کام ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا ہو اور کبھی ترک کیا ہو۔ یعنی جتنی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو کیا ہو تقریباً اتنی مرتبہ چھوڑا ہو۔

مندوب: لغت میں وہ کام جس کی طرف بلایا جائے یا اس پر برانگیختہ کیا جائے اور فقہاء کے نزدیک وہ کام جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر چھوڑا ہو اور کم کیا ہو۔

ادب: لغت میں اچھی روش اور دانش کو کہتے ہیں۔ فقہاء کے نزدیک وہ فعل جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یا دو مرتبہ کیا ہو اور اس پر ہمیشگی نہ کی ہو۔

اُوپر سنت کا جو مفہوم بیان کیا گیا یعنی واجب سے کم درجے کا عمل یہ سنت کا مفہومِ خاص (Meaning in strict sense) ہے۔ سنت کا ایک عام یعنی وسیع مفہوم (Meaning in broader sense) بھی ہے۔ عام طور پر جب سنت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی وسیع مفہوم یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہوتا ہے خواہ وہ فرض ہو یا واجب، سنت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ، آداب میں سے ہو یا شرائط میں سے۔

داڑھی کو جو سنت کہتے ہیں وہ بھی اسی وسیع مفہوم میں کہتے ہیں یعنی کہ داڑھی رکھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ رہا اس کا فقہی حکم تو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بار بار حکم دیا ہے اور تاکید سے حکم دیا ہے لہٰذا فقہی اعتبار سے ایک مٹھی کے برابر داڑھی رکھنا واجب ہے۔

(مستفاد از ''سنت کا مفہوم اور اتباع سنت کی اہمیت''، لمولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ)

مندرجہ بالا تعریفات سے معلوم ہوا کہ جن احکام کو شریعت نے کرنے کا حکم دیا ہے ان میں مرتبے کے لحاظ سے سب سے آخر میں ادب ہے۔ اسی ادب کے بارے میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' جلد اول صفحہ ۷۶ میں لکھا ہے وقد شرع لاکمال السنة یعنی یہ ادب سنت کی تکمیل کے لیے

مشروع کیے گئے ہیں۔ تو جب ادب سے سنت کی تکمیل ہوتی ہے تو مندوب اور مستحب سے یہ تکمیل بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

مستحب، مندوب، ادب کا حکم:

ان کا کرنے والا ثواب کا مستحق ہے اور نہ کرنے والے پر کسی قسم کا گناہ نہیں لیکن کسی مستحب کو اگر شروع کیا جائے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اگر درمیان میں اسے چھوڑ دیا تو قضا واجب ہوگی۔

(اُصول فقہ لمولانا عبید اللہ اسعدی)

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کے چھوڑنے والے پر ملامت نہیں کی تو پھر علماء تارک سنت مؤکدہ کو قابل ملامت کیوں ٹھراتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنت کے تارک پر ملامت فرماتے تو سنت کی حیثیت بدل جاتی اور واجب ہو جاتا اور اُمت پر مشقت بڑھ جاتی۔ تمام انبیاء علیھم السلام اور بطور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر بہت مہربان تھے اور اُمت کی مشقت کو نہیں بڑھانا چاہتے تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کے تارک پر ملامت نہیں فرمائی۔ لیکن سنت (بطور خاص سنت مؤکدہ) دین کا ضروری حصہ، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق کے اظہار کا بہترین ذریعہ اور خود خالق کائنات کا محبوب بننے کا بہترین وسیلہ ہے۔ آج اُمت کا اصل مرض بھی سنت کی ناقدری ہے۔ چونکہ علمائے کرام کے سنت کے تارک پر انکار (ملامت) سے سنت کی حیثیت واجب کی نہیں ہو جاتی بلکہ سنت ہی رہتی ہے لہٰذا علمائے کرام کو چاہئے کہ عوام کو سنت کے اہتمام کی طرف توجہ دلائیں اور بالخصوص سنت مؤکدہ کے ترک پر انکار (ملامت) کریں۔

سنت کو چھوڑنا کب جائز ہے؟

اگر کسی جگہ اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر سنن عادیہ میں سے کسی سنت کو اختیار کیا جائے گا تو کم فہم مسلمان اس سنت کا مذاق اڑائیں گے تو وہاں اس سنت کو چھوڑنا چاہئے (کیونکہ یہ سنت مؤکدہ تو ہے نہیں) جبکہ سنت کی توہین کا ارتکاب صرف گناہ ہی نہیں بلکہ آدمی کو کفر تک پہنچا دیتا ہے لہٰذا یہاں سنت پر عمل کرنے والا دوسرے مسلمانوں کے کفر کا سبب بنے گا۔ لیکن یہ بات صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے اگر اس بات کا احتمال ہو کہ اگر سنت پر عمل کیا جائے گا تو کافر مذاق اڑائیں گے تو وہاں سنت کو نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ کافر پہلے سے ہی کافر ہے۔ (مستفاد از حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا اصلاحی خطبہ "دعوت وتبلیغ کے اصول")

لیکن سنت مؤکدہ کو اس عذر کی بناء پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سنت کے بارے میں ایک عجیب واقعہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہے سنت عادیہ کے اتباع میں ان کی خانقاہ میں جو کی روٹی پکائی گئی۔ حضرت صاحبؒ نے مع فقراء کے نوش فرمائی۔ جو کے کھانے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے سب کے پیٹ خراب ہوئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس سنت کے بارے میں غیر محتاط الفاظ کہہ دے جس سے سنت کی ہتک ہو جائے حضرت صاحبؒ نے فوراً فرمایا "بھائی دراصل ہم اس سنت پر عمل کرنے کے اہل ہی نہیں تھے۔"

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحبات، مندوبات اور آداب پر مداومت نہیں کی تو پھر علماء اور صوفیاء ان پر مداومت کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان اعمال پر ہمیشگی فرماتے تو یہ اعمال سنت مؤکدہ بن جاتے اور سنت مؤکدہ عمل کے اعتبار سے واجب ہے لہٰذا اُمت کی مشقت بڑھ جاتی۔ اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اعمال کو ان کے کرنے کی چاہت کے باوجود ترک کر کے مجاہدہ برداشت کیا اور اُمت کے لیے آسانی پیدا فرمائی۔ جو دینی فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ ان آداب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں ایک یا دو مرتبہ عمل کیا ہے لہٰذا ہمیں بھی اتنا ہی عمل کرنا چاہیئے اس سے زیادہ نہیں کرنا چاہیئے وہ لوگ غلطی پر ہیں۔

البتہ آداب و مستحبات پر ہمیشگی سے عمل کرنا تب مفید ہے جب درج ذیل دو باتوں کا خیال رکھا جائے۔

(۱) دل سے فرضیت کا عقیدہ نہ ہو۔

(۲) ان آدب و مستحبات کے ترک کرنے والے پر نکیر وانکار نہ کرے۔

بلکہ ان آداب و مستحبات کا حکم یہ ہے کہ عوام کو ان کی ترغیب تو دی جائے گی کہ اس طرح کر لو تو اچھی بات ہے لیکن ان کے کرنے کا امر نہیں کیا جائے گا اور ان کے نہ کرنے پر ملامت نہیں جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شاگرد ہو یا بیٹا ہو یا زیر تربیت مرید ہو تو بیشک اس کو کہہ دینا چاہیئے کہ فلاں وقت تم نے فلاں مستحب عمل کو چھوڑ دیا تھا یا فلاں ادب کا لحاظ نہیں کیا تھا، اس کو کرنا چاہیئے، چھوڑنا نہیں چاہیئے۔

("تبلیغ ودعوت کے اصول" اصلاحی خطبہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ العالی مع تغیر یسیر)

ان آداب کے برعکس بعض کام ایسے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں ایک یا دو مرتبہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کام خواصِ امت یعنی علماء وصلحاء کو نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ وہ کام ہیں جن کو حضور

صلی اللہ علیہ نے بیان جواز کے کے لیے کیا ہے اور آداب و مستحبات کے برعکس یہ کام اپنی ذات کے اعتبار سے پسندیدہ نہیں ہیں اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہ کیے ہوتے تو آج یہ ناجائز ہوتے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنابت کی حالت میں غسل کو مؤخر کر کے سونا۔ یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چاہت کی قربانی دی اور امت کے لیے آسانی پیدا فرمائی۔ یہاں بھی عوام کو ان اعمال سے روکنا اور ان پر ملامت کرنا درست نہیں ہاں اپنی اولاد، اپنے شاگرد یا مرید وغیرہ کو کہنا درست ہوگا۔

ان پسندیدہ اعمال پر عمل کرنے والے کی محسوسات میں مثال:

محسوسات میں اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ فرض گھر کے چھت والے رہائشی حصہ کے بمنزلہ ، واجب بمنزلہ صحن اور سنت بمنزلہ چار دیواری کے ہے۔ پھر جو آدمی فرائض و واجبات و سنن کی پابندی کے بعد آداب، مندوبات اور مستحبات پر بھی عمل کرتا ہے تو گویا کہ اس کے گھر کی چاردیواری کے باہر بھی تین مزید حفاظتی دیواریں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس کا گھر گویا ''حصن حصین'' یعنی مضبوط قلعہ بن گیا ہے، جس پر اگر دشمن حملہ کرنے کی کوشش کرے گا تو آسانی سے کامیاب نہیں ہوگا۔ اسی طرح ان اعمال کی پابندی کرنے والے پر حملہ کرنا شیطان کے لیے بہت مشکل ہوگا۔

کھانے پینے کی چیزوں میں اس کی محسوس مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ گویا فرض بمنزلہ روٹی، واجب بمنزلہ سالن، سنت بمنزلہ کھیر اور فرنی ہے جبکہ مستحبات، مندوبات اور آداب بمنزلہ پھل، مقویات اور مفرحات کے ہیں۔ لہٰذا جو مسلمان فرائض، واجبات وسنن کی پابندی کے بعد مستحبات، مندوبات اور آداب کی بھی رعایت کررہا ہے گویا کہ وہ روٹی، سالن اور کھیر فرنی کے بعد تازہ پھل، مقویات اور مفرحات بھی استعمال کررہا ہے۔ ایسے آدمی کے مزے کے کیا کہنے! پھر ان سب چیزوں کے مسلسل استعمال سے جسمانی صحت اتنی اچھی ہو جاتی ہے کہ اگر بیماری حملہ کرے تو آسانی سے نہیں کرسکتی۔ اسی طرح جب ان چھ دینی وروحانی اعمال کی اپنے شرائط کے ساتھ کچھ عرصہ پابندی کی جاتی ہے اور پہلے درجے میں جب ان اعمال کی عادت اور پھر یہ عادت اخلاص کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہے تو اسی دنیا میں وہ روحانی مزے ملتے ہیں جن کے سامنے دنیاوی مزے ہیچ ہیں۔ اور ان اعمال کی پابندی کی مشق سے وہ روحانی قوت حاصل ہوتی ہے کہ ابدی دشمن (شیطان) بہکا نہیں سکتا اور شیطان کے بہکاوے سے بچ کر جو آخرت میں پہنچ جاتا ہے اس کو وہ کامیابیاں وکامرانیاں اور مزے ملتے ہیں جن کا دنیا میں تصور بھی ممکن نہیں۔

حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہ

رحمۃ اللعالمینؐ

کسی کا ذکر ہے اور اہلِ محفل مست و بیخود ہیں — بظاہر یہاں نہ ساقی ہے نہ صہبا ہے نہ پیمانہ

آرزو آدم و عیسیٰ نے تمہاری کی ہے — کتنے معصوم رسولوں کی تمنا تم ہو

ربیع الاوّل کا مہینہ تو ساری کائنات کی روحانی بہار ہے کیونکہ اس مہینہ میں مقصد آفرینش کائنات یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ورودِ مسعود ہوا۔ آپؐ کا چرچا تو آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہی شروع تھا چنانچہ ہر نبی نے آپؐ کی آمد کی بشارت دی۔ انبیاء علیہم الصلوۃ السلام کے علاوہ وہ کتابیں جن کے آسمانی ہونے کے پورے ثبوت نہیں ہیں جیسے ''وید'' وغیرہ ان میں بھی آپؐ کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ نجومیوں اور کاہنوں کی اتنی پیشن گوئیاں ہیں کہ اُس زمانے کے اہم علمی مراکز، مختلف ممالک کے بادشاہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں تھے کہ آپؐ کے ظہور کا وقت بالکل پورا ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کے چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

۱) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے سات سو سال پہلے ابو کرب بن اسعد حمیری تبع نے جب اپنی مملکت کی وسعت کے خیال سے مدینہ طیبہ پر حملہ کا ارادہ کیا تو اپنے ساتھ فوج کے علاوہ چار سو علماء بھی لایا۔ انھوں نے اور بقول بعض علمائے سیرت کے مدینہ منورہ کے یہودی علماء نے ''تبع'' کو یہ مشورہ دیا کہ چونکہ ''یہ بستی نبی آخر الزمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت گاہ ہے اس لیے اس پر حملہ کرنے سے باز آ جائے، چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کیا اور ایک تحریر میں اپنے واپس جانے اور اسلام لانے پر مندرجہ ذیل اشعار بھی کہے اور لکھے:

شَہِدْ تُ عَلیٰ اَحْمَدَ اَنَّہٗ — رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ بَارِئِ انسَمِ

فَلَوْ مُدَّ عُمْرِیْ اِلٰی عُمُرِہٖ — لَکُنْتُ وَزِیْرًا لَّہٗ وَابْنَ عَمّ

ترجمہ: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم اس اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو کائنات کا خالق ہے۔ اگر میری زندگی میں وہ تشریف لائے تو میں ان کا بوجھ اٹھانے والا اور چچازاد بھائی بن جاؤں گا۔

اور وطن لوٹنے سے پہلے ایک مکان تیار کیا جس میں اپنے ساتھ آنے والے علماء کرام کے صدر کو آباد کرتے ہوئے یہ کہا کہ جوں ہی سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں یہ میرا خط اور یہ مکان ان کے

حوالے کر دیں۔ چنانچہ وہ مکان بطور وراثت کے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس میں سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول رحمت فرمایا۔'' (وفاءلوفاء۔ جلدا)

۲) بھارت میں چھپنے والی کتاب ''کالکی اوتار'' میں ہندو برہمن پنڈت وید پرکاش نے تحریر کیا ہے کہ ویدا میں درج ہے کہ کالکی اوتار (بھگوان کا آخری پیغمبر) پوری دنیا کو رہنمائی فراہم کرے گا، وہ ایک جزیرے میں جنم لے گا (عرب کے علاقے کو جزیرۃ العرب کہا جاتا ہے) اس کے باپ کا نام وشنو بھگت ہوگا اور ماں کا نام سومانب ہوگا۔ سنسکرت میں وشنو، اللہ اور بھگت، غلام یا بندہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اس طرح وشنو بھگت کا عربی ترجمہ عبداللہ بنتا ہے۔ سومانب سنسکرت میں امن و آشتی کو کہتے ہیں اس کا عربی ترجمہ آمنہ ہے۔ ''کالکی اوتار'' میں مزید لکھا ہے کہ بھگوان اپنے خاص پیغام رساں کے ذریعے انھیں ایک غار میں علم سکھائیں گے، یہ غارِ حرا اور جبریل امین کی طرف اشارہ ہے۔ پھر لکھا ہے کہ بھگوان کالکی اوتار کو ایک تیز رفتار گھوڑا دیں گے جس کی مدد سے وہ اس دنیا کے گرد اور ساتوں آسمانوں کی سیر کریں گے، یہ براق اور معراج کی طرف اشارہ ہے۔ مقدس کتاب میں تحریر ہے کہ کالکی اوتار گھڑ سواری، تیر اندازی اور تیغ زنی میں ماہر ہوگا۔

۳) وید میں ہے کہ ایک جگت گرو (عالمی پیغمبر) آئے گا جس کی پیدائش ڈھائی پہر دن چڑھے ہوگی، اس کی شادی ایک بہت مالدار عورت سے ہوگی اور اس کی شادی سومنی سے ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش صبح صادق کو ہوئی ہے۔ جس وقت مکہ مکرمہ میں صبح صادق ہوتی ہے ہندوستان میں صبح صادق کے بعد ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہوتے ہیں۔ آپؐ کی پہلی شادی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے ہوئی جو مکہ مکرمہ کی تجارتی منڈی کے آدھے سرمائے کی مالکہ تھیں۔ سومنی سنسکرت کا لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ عائشہ ہے۔ (بحوالہ مولانا محمد عمر پالنپوری)

ہندوستان میں رائج بکرمی سن کا مؤجد مہاراجہ بکرماجیت ایک بہت ماہر نجومی گزرا ہے، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً چھ سو سال پہلے آپؐ کی پیدائش کی پیشن گوئی کی تھی۔ اس کی ایک تحریر ہے'' نکلنک کی پران'' یعنی معصوم کی نعت اس نے اپنے حساب کتاب میں ایک ایسی ساعت کی تلاش کی کوشش کی ہے جس میں کوئی برج نحس نہ ہو، نظر سیارگان درست ہو، کوئی ستارہ حبوط میں نہ ہو، اس ساعت کو اس نے اپنے زمانے کے تقریباً چھ سو سال بعد پایا۔

(بقیہ صفحہ '۱۵' پر)

ہمارے دیوبند کے بانیوں میں حاجی عابد علی صاحبؒ، مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ ہیں۔ حاجی عابد علی صاحبؒ یہ بانی ہیں اور وہ عالم نہیں تھے لیکن بہت بڑے عارف اور تعلق مع اللہ والے تھے۔ اور تعویذ تو ان کا ایسا چلتا تھا کہ بس نہ پوچھو۔ ایک آدمی عدالت میں پیش ہو رہا تھا، اس کا بیان لینے کا جب وقت آیا تو اس نے کہا او ہو میں ابھی آتا ہوں، جج نے کہا کدھر جاتے ہو؟ اس نے کہا کہ حاجی صاحبؒ کا تعویذ باہر رہ گیا ہے وہ لاتا ہوں، تو جج نے کہا لاؤ حاجی صاحبؒ کا تعویذ ہم بھی دیکھیں کیا کرتا ہے، اس نے تعویذ پگڑی میں رکھا اور بیان دیا۔ تو جج نے نیت کی ہوئی تھی کہ اس کے خلاف فیصلہ لکھوں گا اور

اس نے اس کے خلاف فیصلہ لکھ کر دستخط کر کے دے دیا۔ جب آدمی کو فیصلہ ملا تو وہ اس کے حق میں تھا۔ جب جج کو پتہ چلا تو اس نے فائل کو لا کر دیکھا دیا تو not اور should not کا فرق اس سے لکھتے ہوئے ہو گیا تھا۔ دستخط تو اس نے کیا ہوا تھا اس لیے فیصلہ نافذ ہو گیا۔ تو موثر حقیقی ذات ذوالجلال ہے۔ جس وقت کوئی افسر یا کوئی آدمی اس حد تک دعوے کی بات کر لیتا ہے گویا کہ وہ ہی موثر حقیقی ہے تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب اللہ کی گرفت میں آ جائے گا۔ ابھی اندر ایک آدمی نماز کے بعد شور کر رہا تھا، سلام پھیرا تو دیکھا کہ بوڑھا آدمی ہے اور ہوش وحواس جگہ پر نہیں ہیں اور مسجد میں آ کر بیٹھا ہوا ہے، تو نفس کہہ رہا ہے کہ جب آدمی بے احتیاطی کی زندگی گزارتا ہے تو آخر میں یہ حال ہوتا ہے۔ تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ '' زان فکر کوه زان چه تابانده سه حال راتلو واله ده ،اسے نه ئی چه دے کے گیر شے،ده زان فکر کوه ''، اپنی فکر کرو کہیں تم پر ایسا حال نہ آ جائے، یا خدانخواستہ اس سے زیادہ نہ آ جائے۔